سامنے ایک الف ننگا بدن لاش کی صورت زمین پر سیدھا پڑا تھا ۔ پیر صاحب اکڑوں بیٹھے اُس بدن پر سر سے لے کر پاؤں تک ہولے ہولے اپنا ہاتھ پھیرے جا رہے تھے ، اَور ساتھ ساتھ حلق اَور ناک کے اندر سے وُہی پرانی لمبی لَے والی گنگناتی ہوئی آواز پیدا کئے جاتے تھے جَیسے وِرد میں مصروف ہوں ، یا کوئی فریاد کر رہے ہوں ۔ سلامت علی اُلٹے پاؤں مُڑنے ہی والا تھا کہ اچانک اُس پُر سکوت جِسم میں ایک اَیسی حرکت ہوئی کہ سلامت علی کا دل اُچھل پڑا ۔ اُس جِسم کا کوئی انگ اپنی جگہ سے نہ ہِلا ، صرف چہرے نے آنکھیں کھول دیں ، جَیسے کہ اُس کے دل پہ کوئی بے آواز دستک ہوئی ہو اَور وہ آنکھیں یکایک جاگ پڑی ہوں ۔

وہ آنکھیں سلامت علی کے دِل میں اٹک گئیں ۔ لمبی پلکوں والی بڑی بڑی ، سیاہ چمکدار اَور روشن آنکھیں ٹُک ٹُک چھت کو تکے جا رہی تھیں ۔ دفعتاً اُس سارے جسم میں ایک شدید جُھرجھری پیدا ہوئی ، سر اُوپر اُٹھا ، اَور مُنہ سے ہلکی سی چیخ نِکل گئی ۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی ۔ پہلے اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتیوں کو ڈھانپا ، پھر گھٹنے اُٹھا کر چھاتی سے لگائے اَور ہاتھوں سے چہرہ چُھپا کر گٹھڑی سی بن گئی ۔ ایک لمحے کے بعد اُس نے والہانہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے اور اپنے کپڑوں کے چھوٹے سے ڈھیر پہ جا گری ۔ سلامت علی کے پاؤں زمین میں گڑے تھے ۔ اُس کے دماغ سے خیال غائب ہو چکے تھے ، صرف آنکھیں کام کر رہی تھیں ۔ اُس کا دل اور دماغ اِن چند لمحوں کے دوران مکمل آرام کی حالت میں تھا ۔ اِس خالی الذّہن صورت میں کھڑے کھڑے اُس کے دِل میں تعجب پیدا ہوا کہ شام کے وقت کیوں اُس کو یاد نہ آرہا تھا کہ مِٹھو چک میں کیا بات تھی ؟ مِٹھو چک میں نسرین بیاہ کے گئی تھی ۔ اِس عام فہم بات کو وہ کیسے بُھول گیا تھا ؟ نسرین کا چہرہ بھا[illegible]ک رہا تھا ۔ جسم بھی شائد کچھ موٹا ہو گیا تھا ۔ چار سال ۔ چار سال میں وہ بدل گئی تھی ؟؟ ۔

اب نسرین کپڑوں کو دونوں ہاتھوں میں لِئے ، اپنے گندمی بدن کے آ[illegible]ائے ، پیروں کے پنجوں پہ گویا ہوا میں اٹکی کھڑی تھی ۔

'شاہ جی ،' وہ بے دم آواز میں بولی ، "اِستخارہ کر رہے تھے"، اَور[illegible]تے ہی دیکھتے ، کپڑوں کو جِسم پہ دبائے بھاگتی ہوئی کمرے سے نِکل گئی ۔

پیر کرامت علی لڑکی کے ساتھ ہی اُچک کر کھڑے ہو گئے تھے ۔ اِس میں اُن کی چادر سر سے اُتر گئی تھی اَور ایک کندھے سے نیچے ڈھلک آئی تھی ۔ ایک لمحے کی اِس حرکت نے اُن کے وجُود سے بیسیوں سہ سال گھٹا دیئے تھے ۔ اُن کے چہرے پہ ہراس کی کیفیت تھی ۔ وہ اس طرح کھڑے تھے جیسے سہما ہوا بچہ کندھے خم کئے ، آنکھیں اُٹھائے اقبالِ جُرم کی حالت میں کھڑا ہوتا ہے ۔ گو اُن کی چادر صِرف سر اَور ایک کندھے سے اُتری تھی مگر سلامت علی کو محسُوس ہو رہا تھا جیسے وہ یکسر برہنہ ہو گئے ہوں ، جیسے اُن کے تیور کی سنجیدگی اَور شخصیت کا تمامتر تقدس ایک فالتو کھال کی مانند اُتر کر گر پڑا ہو ۔ اُن کے انداز کا بھاری بھر کم پن غائب ہو چُکا تھا اَور لگتا تھا کہ کِسی لمحے بھی وہ چڑیا کی طرح پُھدک کر کہیں اَور جا کھڑے ہوں گے ۔ اُنہیں دیکھتے ہوئے سلامت علی کے مُنہ سے صرف ایک لفظ سوال کے طور نِکلا ۔

'تسرین؟؟'

'اِسے اولاد نہیں ہوتی ،' پیر کرامت علی نے چھوٹی سی بے یقین آواز میں جواب دیا ۔

'آپ ۔ ۔ ۔ ؟' سلامت علی آنکھیں پھاڑے اپنے باپ کو دیکھتا رہا ۔ اُس کے چہرے پہ تعجب اَور آزردگی کے مِلے جُلے آثار تھے ۔

آخر پیر کرامت علی اپنے بیٹے کی نظروں کی تاب نہ لا کر جہاں کھڑے تھے وہیں پہ بیٹھ گئے ۔ اُن کا جِسم نحیف و نزار دکھائی دے رہا تھا ۔ اُنہوں نے ہاتھ اُٹھا کر بیٹے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔

'میں کچھ نہیں کرتا ،' وہ بولے ، 'کُچھ بھی نہیں کرتا ۔'

اُن کے مُنہ سے آواز اَیسے نِکلی جیسے اُن کا حلق سُوکھ گیا ہو ۔ 'میں تو کِسی قابل نہیں ہُوں ۔'

سلامت علی فرش پر اپنے باپ کے بالمقابل جا بیٹھا ۔ اُس سے حیرت زدہ مُنہ سے ایک بار پِھر صرف ایک ہی لفظ نِکل سکا ۔

'اِستخارہ ۔ ؟'

'یہ خدا کی قدرت ہے ،' پیر کرامت علی بولے ، 'میں تو عورت کے قابل ہی نہیں رہا ۔'

2009/08/27 19:53

پیر کرامت علی نے ایک لحظے کو نظریں اُٹھائیں ، پھر گرا دیں ۔ اُنہوں نے بیٹے کو مُستقل جواب طلب نظروں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا ۔ وہ دوبارہ بولے ،

'ایک عورت تھی ۔ اُس نے مجھے اِس قابل نہیں چھوڑا ۔ میری مردانگی چھین کر لے گئی ۔'

'کون تھی ؟'

'کوئی عورت تھی ۔ تُم نہیں جانتے ۔ قاتلہ تھی ۔'

'قاتلہ تھی ؟'

'ہاں ۔'

'کیا ہوا تھا ؟'

'اب میں کیا بتاؤں ۔ اس قصے کو چھوڑو ۔ میں تُمہارا باپ ہوں ، بس میری بات پہ یقین رکھو ۔'

'شاہ جی ،' سلامت علی بولا ، 'میں نے ہمیشہ آنکھ بند کر کے آپ کی بات پر ایمان رکھا ہے ۔'

'درست ہے ۔ تُم میرے بیٹے ہو ۔'

'مگر شاہ جی ، آپ ہی کا سبق ہے کہ بات کی حقیقت معلوم کرو ۔ یہ بات مجھے بتائیے ۔'

پیر کرامت علی کئی منٹ تک فرش پر نظریں جمائے بیٹھے رہے ، گویا اپنے شکنجے میں آپ ہی کسے جا رہے ہوں ۔ ایک دو بار بیٹے کو باز رکھنے کی خاطر اُنہوں نے سر اُٹھا کر عمداً اُس کی آنکھوں میں دیکھا ۔ مگر سلامت علی کی پُر تکرار نظروں کے سامنے اُن کی رُوح سُکڑ گئی ۔

'لمبی کہانی ہے ۔ کئی برس پُرانا قِصہ ہے ۔'

'شاہ جی ، جو کچھ بھی ہے ، مجھے کھول کر بتائیے ۔'

2009/08/27 19:53

2009/08/27 19:53

باب پنجم

تین قتلوں کی حکائت :۔

اب وقت ایک بار پھر قریب اٹھارہ برس پیچھے کی جانب لوٹتا ہے ۔ پیر کرامت علی جو کہانی بیان کرتے ہیں وہ اِس سچے واقعے پر مبنی ہے :

آزادی کے پہلے پہلے سالوں کا زمانہ ہے ۔ لوگوں کے دماغوں میں ابھی کامیابی کا اَور ایک خوش آئند زندگی کا نشہ باقی ہے ۔ ماحول بدل چُکا ہے ۔ نوکریوں کے اَور کاروبار کے اَور افسروں تک رسائی کے مواقع زیادہ سے زیادہ بہم پہنچائے جا رہے ہیں ۔ لُٹے پٹے مہاجرین کا سِلسلہ اختتام کو پہنچ رہا ہے ۔ ان حالات میں یکایک اخباروں میں ایک سنسنی خیز وارداتِ قتل کا غلغلہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے ۔ ایک تعلیم یافتہ جوان عورت نے تین مردوں کو ہلاک کر دیا ہے ۔ مُلک بھر کے عوام انگشت بدنداں ہیں کہ کیونکر ایک شریف گھرانے کی پڑھی لکھی عورت ، جو گورنمنٹ سکول میں سابقہ ٹیچر رہ چکی ہے ، اِس بہیمانہ جُرم کی مُرتکب ہوئی ۔

یہ تینوں قتل سَو میل کے رقبے اَور چوبیس گھنٹے کے عرصے کے اندر واقع ہوئے ۔ تیسرے قتل کے بعد مُلزمہ خود جا کر پولیس تھانے میں حاضر ہوئی ، اَور پہلی رپورٹ میں درج ہوا کہ مُلزمہ نے اقبالِ جُرم کیا ۔ لیکن سوائے اِس رپورٹ کے اقبالِ جُرم کا ثبوت اَور کہیں پہ نہیں مِلتا ، کیونکہ باقی کی تمامتر کاروائی کے دوران مُلزمہ نے مُنہ سے ایک لفظ نہیں نکالا اَور نہ ہی سر کی جُنبش سے ہاں یا نہ کرنے کی روادار ہوئی ۔ یہاں تک کہ دفاع کی جانب سے کاغذ قلم کی پیش کش بھی کی گئی جو اُس نے ٹھکرا دی ، یعنی حسب معمول گُنگ بیٹھی ٹک ٹک اپنے سامنے یا پھر زمین پہ دیکھتی رہی ۔ دفاعی وکیل ، جو مُلزمہ کی بہن اَور بہنوئی نے مقرر کیا تھا ، مُلزمہ کے عدم تعاون کے پیشِ نظر کچھ بھی نہ کر سکا ، سوائے اِس

کے کہ پراسیکیوشن کے نکات کا حسبِ مقدور جواب دیتا رہا ۔ دوسری طرف پراسیکیوشن کے ہاتھ میں بھی کوئی ناقابلِ رد کیس نہیں تھا ۔ تینوں وارداتوں میں کسی ایک کا بھی آلۂ قتل برآمد نہیں ہو سکا تھا ۔ پراسیکیوشن مُلزمہ کا کسی ایک مقتول کے ساتھ کسی قِسم کا تعلق ثابت کرنے سے قاصر رہی تھی ۔ علاوہ ازیں کوئی گواہان ، عینی یا غیر عَینی موجُود نہ تھے ۔ غرضیکہ اقدامِ قتل کے محرکات ڈھونڈے نہ مِلتے تھے ۔ پراسیکیوشن کے تمامتر دلائل واقعاتی شہادتوں ، یا مُلزمہ کے از خود پیش ہونے اور اُس کے نام نہاد اقبال جُرم پر مبنی تھے ۔ تاہم ایک بہت بڑا عنصر جو مُلزمہ کے خلاف جاتا تھا وہ اُس کے صنفِ نازک سے تعلق رکھنے کا تھا ۔ اُن دنوں حال ہی میں ایک اور مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تھا جِس میں ایک عورت نے اپنے آشنا کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا ۔ اُس مقدمہ میں دفاع نے عدالت سے التجا کی تھی کہ اِس کیس کو اُنہیں نظروں سے دیکھا اور اُسی سطح پر پرکھا جائے جیسے کہ کسی عام مقدمۂ قتل کو ۔ یہ ایک باریک نُکتہ تھا جس پر دفاع نے کسی حد تک اپنے دلائل کی بُنیاد رکھی تھی ۔ مگر اِس پر عدالت کی رُولِنگ اُن کے خلاف گئی تھی ۔ مُعزّز جج نے کہا کہ اِس کیس کو برابر کی سطح پر نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اس میں عورت کی دِل لُبھانے اور مرد کو ورغلانے کی قوّت کا عنصر شامل ہے ۔ اور یہ ایک ایسا آلہ ہے جو مرد کے حِصّے میں نہیں آیا ۔ (جج نے (Instrument ofAllure) کی اصطلاح استعمال کی تھی ۔ دفاع نے اِس نُکتے کو ایک تکنیکی نکتے کی حیثیت سے پیش کر کے اس پر بحث جاری رکھنے کی التجا کی ، جو عدالت نے کُچھ پس و پیش کے بعد منظور کر لی ۔ پھر پورا ایک دن اِسی بحث میں گُذر گیا ۔ مرد کو ورغلانے کے اِس "آلے" کو قِسم قِسم کے زاویوں سے جانچا اور زیرِ بحث لایا گیا ، جِس کے دوران متعدد بار کاروائی نے مزاحیہ صورت اختیار کر لی اور عدالت کے سامعین ، اور باہر اخبارات کے قارئین کی [illegible] کا باعث بنی ۔) ۔

دوسری وجہ جِس سے عدالت کے رویّے کا تعیّن ہوا وہ مُلزمہ کا عدم تعاون تھا ۔ مُلزمہ کے 'اِس حقارت آمیز سلوک' سے عدالت اِتنی چِڑ گئی کہ دفاع کے آخری حربے ، یعنی مُلزمہ کے دماغی توازن بِگڑ جانے کی اپیل کو خاطر میں نہ لائی ۔

سیشن کورٹ سے مُلزمہ کو دو بار پھانسی ، سات سال قید بامُشقت اور

2009/08/27 19:54

بیس ہزار روپے جُرمانہ ، ایک سال قید باشقت اور دو ہزار روپے جُرمانہ ، بصورت عدم ادائیگی چودہ ماہ اور دو ماہ مزید باشقت ، کی سزا ہوئی ۔

مقدمے کی طویل کاروائی کے باوجود یہ سوال کہ کیوں ایک جوان ، خوش شکل ، شریف اور تعلیم یافتہ لڑکی ایسے اِنسان سوز جرم کی مُرتکب ہوئی ، ایک سربستہ راز ہی رہا ۔ کِسی بشر پہ یہ نہ کُھلا کیونکہ یہ مُلزمہ ، چہرے سے کسی تاثر کا اظہار کئے بغیر ، سزا سُن کر خاموشی سے اُٹھی اور پھانسی کے تختے پر چڑھنے کے لئے چلی گئی ۔ ۔

جیل کا منظر :۔

اب یہ منظر جیل کو منتقل ہوتا ہے ، جہاں قاتلہ رضیہ سلطانہ عرصہ دو ماہ سے پھانسی کی کوٹھری میں مقید ہے جبکہ باہر اپیل کی کوششیں ہو رہی ہیں ۔ پہلے اس کی بہن درخواست دیتی ہے کہ عدالت عالیہ میں اپیل کرنے کی اس کی استطاعت نہیں ، ملزمہ کو بے حیثیت جان کر حکومت کی جانب سے اپیل کی جائے ۔ حکومت حسبِ دستور وکیل مقرر کر دیتی ہے ۔ جو ابتدائی کاروائی کر کے عدالت عالیہ سے اپیل دائر کرنے کی مہلت حاصل کر لیتا ہے ۔ ، پھر پھانسی کو رکوانے کا حکم جاری کروانے کی کاروائی شروع کر دیتا ہے ۔ ساتھ ہی وہ مصر ہو جاتا ہے کہ ملزمہ کی جانب سے پیش رفت کی صورت ہونی چاہیے ۔ اگر وہ خود درخواست نہیں دیتی تو کم از کم رضامندی کا اشارہ دے سکتی ہے ۔ رضیہ سلطانہ کی بہن مختار سلطانہ پھر کوشش کرتی ہے ۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کی نسبت اس قد مختلف عورت ہے کہ دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا کہ یہ دونوں سگی بہنیں ہیں ۔ اپنے خاندانی وصائف کی حامل ، دھیمی اور سلجھی ہوئی طبیعت کی گھر گرہستن ، سیدھی سادی تین بچوں کی ماں ہے ۔ سارا سارا دن جیل کے باہر ، کبھی بچوں کے ساتھ کبھی ان کو چھوڑ کے ، آکر بیٹھی رہتی ہے ، پھر ہر تیسرے چوتھے روز وکیل کی وساطت سے بہن کے ساتھ ملاقات کی اجازت حاصل کرتی ہے ۔ ملاقات کے دوران بہن کی منت سماجت میں لگی رہتی ہے ۔ کہتی ہے مری بہن ، اپنے اوپر تو رحم نہیں کھاتی ، کیا میرے اوپر بھی یہ ظلم روا رکھو گی ؟ میری طرف دیکھو ، میرے ساتھ بات کرو ، تمہیں یاد نہیں ہم ایک ساتھ کھیلا کرتی تھیں ۔ ایک دوسری کے بال نوچا کرتی تھیں ، پھر انہی میں کنگھی کیا کرتی تھی ۔

2009/08/27 19:54

میرے ماں بات کی نشانی ہو ، تمہاری آواز کو ترس گئی ہوں ۔ تمہیں کچھ یاد نہیں ؟ رضیہ سلطانہ کا دل گویا پتھر ہو چکا ہے ۔ بڑی بہن کی طرف نہ دیکھتی ہے نہ بات کرتی ہے ۔ ادھر وکیل اصرار نہیں چھوڑتا کہ رضیہ سلطانہ کے تعاون کے بغیر اپیل بیکار ہے ، پھر وہ الٹی میٹم دے دیتا ہے کہ تین دن کے اندر اس بارے میں پیش رفت نہ ہوئی تو وہ مزید کاروائی ترک کر دے گا ۔ ممتاز سلطانہ پھر ایک بار کوشش کرتی ہے ، مگر بے سود ۔ رضیہ ٹس سے مس نہیں ہوتی آخر وکیل اپیل کو واپس لے لیتا ہے ۔ معاملہ ختم ۔ سیشن کی سزا بحال رہتی ہے ۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ بلیک وارنٹ جاری ہو جائے گا ۔ اس میں کوئی شک نہیں ۔

اِس سارے عرصے میں مُجرمہ نے اپنا طور برقرار رکھتے ہوئے مُنہ سے کوئی بات نہیں نِکالی ، بس ایک گُھنگ خاموشی اپنے اوپر طاری کِئے کوٹھڑی میں وقت گُذار رہی ہے ۔ علاوہ اِس چُپ کے اَور کوئی آثار اُس کے اُوپر نمایاں نہیں ہیں جِن سے اُس کی دماغی صحت پر شک ہو سکتا ہو ۔ کھانا پینا ، رفع حاجت ، سب ضروریاتِ زندگی بقدرِ ضرورت نبٹاتی ہے ۔ البتہ نماز ادا نہیں کرتی ۔ پھانسی کی کوٹھڑی والوں کا دستُور ہے کہ اُن میں سے بیشتر دِن اَور رات کے اکثر اوقات تلاوتِ قرآن اَور نماز ادا کرنے میں صرف کرتے ہیں ۔ بڑے بڑے پیشہ ور مُجرم 'کوٹھی لگتے' ہی استغفار پڑھ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیتے ہیں ۔ یہ بات مصدقہ ہے کہ جیل کے دوسرے حصّوں کی نِسبت 'کوٹھی' والوں کا ماحول پاک صاف اَور عبادت گُذار ہوتا ہے ۔ رضیہ سلطانہ کا رویّہ اِس ضِمن میں مُختلف ہے ۔ نہانا دھونا اَور تبدیلیٔ لباس تو درکنار ، اپنے آپ کو ٹھیک سے صاف بھی نہیں رکھتی ۔ بدنی طہارت کا اُسے کچھ خیال نہیں ، سرسری پُونچھ پانچھ کر فارغ ہو جاتی ہے ۔ ساتویں آٹھویں روز لیڈی وارڈر آکر زبردستی اُسے نہلاتی ہے ، اُس کے کپڑے اُتار کر اُس کے گرد چادر لپیٹ دیتی ہے اَور کپڑے دھونے کو لے جاتی ہے ۔ مُجرمہ کو اپنے ستر کا بھی پاس نہیں ہے ۔ چادر سینے سے ڈھلک جائے تو ڈھلک جائے ، سیدھی کرنے کی توفیق اُسے نہیں ہوتی ۔ جب وارڈر دُھلے ہوئے کپڑے لاکر اُسے پہنانے لگتی ہے تو وارڈر کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ [illegible] اُسے کہتی ہے نماز پڑھو ، توبہ کر لو ، تو مُجرمہ رضیہ سلطانہ اُسے جواب دیتی ہے ، 'میں ناپاک ہوں ۔ نماز کیسے

2009/08/27 19:54

پڑھوں ۔' نہانے کے بعد بھی یہی بہانہ استعمال کرتی ہے ، 'میں ناپاک ہوں ۔' بس یہی ایک جملہ اُس کے مُنہ سے دو مہینے میں ادا ہوتا ہے ۔ سب حیران ہیں کہ یہ کیسی عورت ہے ، نہ مقدمے میں اپنی مدافعت کی ، نہ اپیل میں مدد ، نہ جُرم کی کوئی وجہ بیان کی ، اَور نہ اب توبہ ہی کرتی ہے ۔ نہ بولتی ہے نہ چاہتی ہے ، بس مُہر بلب کوٹھی لگی ہوئی ہے ۔

صرف دو لفظ مزید اُس کے مُنہ سے پہلے ہی روز نکلے تھے ، اَور وہ بھی بے اختیار سخت حیرانگی کے عالم میں ، جب اُس نے کوٹھڑی کے باہر جوان وارڈرن کرامت علی کو کھڑے ہوئے دیکھا تھا ۔

'کرامت ،' وہ کھلے مُنہ سے بولی تھی ۔ 'تُم ؟'

اُس کے بعد پھر وُہی چُپ ۔

اب حقیقت کُھلتی ہے کہ رضیہ سُلطانہ کرامت علی کی پُرانی ساتھی اَور اُس کے جگری دوست فیروز شاہ کی محبُوبہ تھی ، جس کے جُرم کا اخباروں میں تذکرہ پڑھ کر کرامت علی بھی ہزاروں لاکھوں دوسرے لوگوں کی طرح دانتوں میں اُنگلیاں دابے ہوئے تھا ، گویہ اُس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ اُسی کی جیل میں آکر کوٹھی لگے گی ۔ یہ اتفاق تھا یا خُدا کا کرنا ، کہ زندگی میں ایک بار پھر اِن دونوں کا سامنا ہونا تھا (جس کے دور رس نتائج کا اُس وقت کسی کو علم بھی نہ تھا ۔) رضیہ سلطانہ کو دیکھ کر کرامت علی کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ 'رضو ،' وہ بے اختیار پُکار اُٹھا تھا ، 'تُم یہاں آگئی ہو ؟' اَور رضیہ سلطانہ جواب میں مُنہ موڑ کی بیٹھ گئی تھی ۔

وہ دِن تھا اَور آج کا ، کرامت علی لاکھ کوشش کرتا ہے کہ رضیہ سلطانہ کوئی بات مُنہ سے نکالے ، کچھ اُگلے ، کوئی راز فاش کرے ۔ وہ اُسے خدا کا ، مذہب کا ، پُرانی رفاقت کا ، اپنے مُردہ دوست کا ، حُب الوطنی کا ، قانون کا ، آخرت کا واسطہ دیتا ہے کہ وہ کچھ بتائے ، کچھ بولے ، خدا کے حضور بخشش طلب کرے ۔ مگر رضیہ سلطانہ نے ایک چُپ جو سادھ لی ہے اُسے نہیں توڑتی ، اُس کے لب وا نہیں ہوتے ۔ آخر اُس کی خاموشی ایک بھاری وزن بن کر کرامت علی کے دِل پر بیٹھنے لگتی ہے ۔ یہاں سے رضیہ سلطانہ کا رویّہ ، اُس کے حرکات و سکنات ، اُس کا جُرم ، حتّٰی کہ اُس کا وجود تک کرامت علی پہ اثر انداز ہونا شروع ہوتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ رضیہ سلطانہ کی چُپ اُسے کھا گئی ہے ۔

2009/08/27 19:54

رر حقیقت یہ چُپ اُس کی ساری شخصیت پہ چھاتی چلی جاتی ہے ۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ نہ ہنستا ہے ، نہ بولتا ہے ، نہ کوئی بات کرتا ہے ، بس اپنے جسم کا بوجھ اُٹھائے اپنا کام کرتا رہتا ہے ، اَور باقی کا وقت اپنے دِل کے اندر سکڑ کر بیٹھا رہتا ہے ۔ زیادہ سے زیادہ دِن میں ایک آدھ بار رضیہ سلطانہ کی کوٹھڑی کا چکر لگا لیتا ہے ۔ وہاں کوٹھڑی کے باہر چند منٹ کو رُک کر خاموشی سے قیدی کو دیکھتا ہے ، جو اندر بیٹھی ٹک ٹک دیوار کو دیکھ رہی ہوتی ہے ، یا کبھی خاموشی سے کرامت علی کو دیکھنے لگتی ہے ۔ پھر وہ واپس آجاتا ہے ۔ وہ اُس کا معمول بن گیا ہے ۔ اُسے فیروز شاہ کی یاد بھی ستاتی رہتی ہے ۔ عجیب بات ہے کہ جب سے فیروز شاہ کی موت واقع ہوئی ہے وہ کبھی کرامت علی کو اتنی کثرت سے یاد نہیں آیا جتنا اِن دنوں میں آتا ہے ۔ اُسے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اِس جُرم اَور فیروز شاہ کی موت کے درمیان گہرا رشتہ ہے ۔ یہ سوچتے سوچتے اُسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے فیروز شاہ ابھی کل ہی مرا ہو اَور اُس کی تازہ تازہ لاش آس پاس ہی کہیں پہ پڑی ہوئی ہو ۔ اُسے جاگتے ہوئے بھی 'نظارے' نظر آنے لگتے ہیں ۔ رضیہ سلطانہ کی خاموشی اَور فیروز شاہ کی یاد نے مِل جُل کر اُس کی رُوح کو پِسل کے رکھ دیا ہے ، لیٹا ہے تو اُٹھ بیٹھنے کو اَور بیٹھا ہے تو اُٹھ کھڑا ہونے کو جی نہیں کرتا ۔ یہاں تک کہ اُس کی بیوی نے بھی اُس کی حالت دیکھ کر تذکرہ کیا ہے ، مگر کرامت علی میں اتنی ہِمت بھی نہیں رہی کہ بیوی کی بات کا ڈھنگ سے جواب دے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی قوتِ ارادی فالج کے اثر میں آگئی ہے ۔

اِسی طرح آخری دِن آپہنچتا ہے ۔ دستور کے مطابق اسسٹنٹ سُپرنٹنڈنٹ اَگر رضیہ سلطانہ کو اطلاع دیتا ہے کہ اگلے دن صُبح صادق کے وقت اُسے پھانسی پر چڑھایا جائے گا ۔ آخری ملاقاتوں کی فہرست کے بارے میں ایک بار پھر وہ رضیہ سلطانہ سے استفسار کرتا ہے ۔ مزید کہتا ہے کہ اگر کوئی آخری خواہش رضیہ سلطانہ کے دِل میں ہے تو بتا دے ، اس پہ ہمدردی سے غور کیا جائے گا ۔ علاوہ ازیں یہ کہ گو اب وقت بُہت کم رہ گیا ہے لیکن کسی مولوی ، کسی عالم دین ، کسی مذہبی راہنما سے رجُوع کرنا چاہے تو اِس سلسلے میں اب بھی کوشش ہو سکتی ہے ۔

2009/08/27 19:55

جواب میں رضیہ سلطانہ کا چُپ کا روزہ ایسے برقرار رہتا ہے گویا کبھی ٹوٹے

گا ہی نہیں ، فقط خالی خالی نظروں سے آدمیوں کو دیکھتی ہے جیسے کہ اُس کے سامنے کوئی اَور ہی زبان بولی جا رہی ہو جس کا ایک ایک لفظ اُس کی سمجھ سے باہر ہو ۔ کرامت علی اَور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سمیت سب لوگ مایُوس ہو کر لوٹ آتے ہیں ۔ ان سب کے دِل بھاری ہیں اور ان میں غُصّے کا اثر ہے ، جیسے کہ خود اُنہوں نے کوئی قصور کیا ہو اَور اس کا جوابدہ ہونا پڑ رہا ہو ۔ یہ منظر آخری دِن کا اِس مقام پہ ختم ہوتا ہے ۔ اِس سے آگے آخری رات شروع ہوتی ہے ۔

آخری رات کی داستان :۔

جب کرامت علی حسبِ دستور رضیہ سلطانہ کو کوٹھڑی کے سامنے جا کر کھڑا ہوا تو حیرانی کے مارے اُس کے اوسان خطا ہونے کو آئے ۔ رضیہ سُلطانہ کوٹھڑی کے دروازے سے لگ کر کھڑی تھی اَور اُس کے لب وا تھے ، گویا آواز کے اِنتظار میں ہو ۔

"کرامت ،" وہ دیکھتے ہی بولی ، "سُپرنٹنڈنٹ سے کہو میں رکھوال کے مولوی احمد شاہ کے سامنے توبہ کرونگی" ۔ سخت تعجب کی حالت میں کرامت علی کے مُنہ سے نِکلا ، "فیروز شاہ کا باپ !" پھر وہ اِنتظار کِئے بغیر اُلٹے پاؤں مُڑا اَور بگٹٹ سُپرنٹنڈنٹ کے دفتر پہنچا ۔

"خود مُنہ سے بولی ہے ؟" اسسٹنٹ سُپرنٹنڈنٹ نے پیغام سُن کر پوچھا ۔

"جی بِالکل ۔" کرامت علی نے اَیسے فخریہ لہجے میں جواب دیا گویا ایک قاصد خوشنودی لے کر کِسی بادشاہ کے دربار میں پہنچا ہو ۔

"دِل سے تو نہیں گھڑی ۔"

"جی بالکل نہیں ۔"

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے سوچتے ہوئے لمبا سا "ہُوں" کِیا ۔ "یہ رکھوال کا مولوی ہے ؟"

"جی ہاں ۔"

"مقتول بھی سارے رکھوال کے ہی تھے نا؟"

"جی سارے رکھوال کے تھے ۔"

"اب اس مولوی کو اِس وقت کہاں سے ڈھونڈیں ، اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ چڑ کر بولا ۔" بدبخت نے آخری وقت بھی آرام خراب کِیا ۔ مولوی

2009/08/27 19:55

کے ساتھ بھی کسی نہ کسی کی ڈیوٹی لگے گی ۔ پھانسی پر پہلے ہی میری ڈیوٹی ہے ۔ رات برباد گئی ۔ سپرنٹنڈنٹ سے بات کرتا ہوں ۔"

کرامت علی جو اُس وقت تک ضبط کئے کھڑا تھا ، آخر بول اُٹھا ۔ "میں رکھوال کا ہوں جناب ۔ مولوی احمد شاہ کو جانتا ہوں ۔ آپ بولیں تو جا کر لا سکتا ہوں ۔"

"تم رکھوال کے ہو ؟" اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا ۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا ؟"

"سب جانتے ہیں جی ۔ سپرنٹنڈنٹ صاحبؒ کو بھی پتا ہے ۔ آپ نئے آئے ہیں ۔"

"یہ مولوی کون ہے ؟"

"امام مسجد ہیں ۔ ان کے باپ دادا بھی پیش امام تھے ۔ عالم دین ہیں ۔ بڑے نیک بزرگ ہیں ۔"

"مُجرمہ کی ان سے کوئی رشتہ داری ہے ؟"

"جی نہیں ۔"

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پھر سوچ میں پڑ گیا ۔ "اچھا ،" وہ بولا ، "پندرہ منٹ تک آنا ۔ باہر ٹھہرو ۔"

پندرہ منٹ کے بعد کرامت علی پیش ہوا تو اسسٹنٹ صاحب فیصلے کو پہنچ چُکا تھا ۔ اُس نے کرامت علی کو حکم دیا کہ وہ جیل کی گاڑی لے کر جائے اور احمد شاہ کو لے آئے ، وقت کم ہے ۔

کرامت علی جب گاؤں پہنچا تو احمد شاہ کی کوئی خبر نہ تھی ۔ اُس کی بیوی کو بھی علم نہ تھا کہ کہاں پر ہے ۔ سوائے انتظار کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا ۔ احمد شاہ عشاء کے قریب واپس لوٹا ۔ پُوچھنے پر پتا چلا کہ گاؤں سے کچھ دُور حُسین احمد کے ڈیرے پہ گیا تھا ۔ حُسین احمد کی بیٹی پہ جِنّوں کا سایہ تھا ۔ جب بھی جنات آکر پکڑتے تھے وہ عربی فارسی میں بولنا اور پھاڑس مارنا شروع کر دیتی تھی ۔ پھر اُس کا باپ ، میاں احمد شاہ کو دم درُود پڑھنے کو بُلا بھیجتا تھا ۔ کرامت علی کو دیکھ کر احمد شاہ بُہت خوش ہوا ۔ پھر اُس نے اپنے بیٹے کو یاد کر کے چند [illegible] چکیں تو وہ کرامت علی کو لے کر نماز

2009/08/27 19:55

پر جانے چلا گیا ۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی کرامت علی نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا ۔ اسے سُن کر احمد شاہ اُچھل پڑا ۔ پہلے تو اُسے کرامت علی کی زبان پہ یقین نہ آیا ۔ احمد شاہ تینوں مقتولوں سے واقف تھا ۔ تینوں کے تینوں نہایت متقی ، پرہیزگار اور پاکباز آدمی تھے اور احمد شاہ کی اُن کے گھرانوں سے ایک زمانے کی جان پہچان رہی تھی ۔ اپنی نیکی اور بزرگی کے باوجود احمد شاہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا ۔ اُس کے مُنہ سے قاتلہ کے لئے بے اختیار گالی نکل گئی ۔ کرامت علی کو ، جس کا دِل اپنے مُردہ دوست کے بھید سے واقف تھا ، یہ سُن کر دُکھ ہوا ، مگر وہ اپنے دِل سے وعدہ کر چُکا تھا کہ احمد شاہ کے سامنے ، کم از کم آج رات کی حد تک ، وہ اِس راز کو فاش نہیں کرے گا ، اِس لئے خاموش رہا ۔ صرف اُس نے اِتنا کہا ۔

"میاں جی ، آپ ہی تو گزرے ہوئے لوگوں کی رُوحوں کے رکھوالے ہیں ۔ اسی لئے وہ آپ کے سامنے توبہ کرنا چاہتی ہے ۔ اللہ کا بھی حکم ہے کہ گناہگار کو موقع دیں ۔" احمد شاہ نے مزید پس و پیش کیا تو کرامت علی بولا کہ یہ حکومتی حکم ہے ، چونکہ وہ ذاتی طور پر احمد شاہ کا جاننے والا ہے اِس لئے خود ہی اُٹھ کر چلا آیا ہے ۔ لیکن اگر ایسی بات ہے تو وہ جیل کی حکومت سے طلبی کا پروانہ بھی لے کر آسکتا ہے ۔ یہ سُن کر احمد شاہ کے پاس کوئی جواب نہ رہا ۔

جب وہ جیل خانے پہنچے تو آدھی رات نکل چکی تھی ۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اپنے دفتر میں بے چین بیٹھا اُن کا انتظار کر رہا تھا ۔ دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا ۔

"آپ رکھوال کے مولوی احمد شاہ ہیں ؟" اُس نے پوچھا ۔

"جی ہاں ،" احمد شاہ نے جواب دیا ۔

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے ایک کاغذ پہ اُس کے دستخط کروائے ، پھر چابیاں کرامت علی کو پکڑاتے ہو بولا ۔ "تمہاری اور مسعودہ خانم کی ڈیوٹی مولوی صاحب کے ساتھ ہوگی ۔ مجھے چار بجے پھر واپس آنا ہے ۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا ۔

کرامت علی اور لیڈی وارڈر مسعودہ خانم احمد شاہ کو اپنے ہمراہ لے کر رضیہ سلطانہ کی کوٹھڑی کو روانہ ہوئے ۔

"یہ دیکھو ،" مسعودہ خانم اپنی کلائی دکھاتے ہوئے بولی ، جس پہ ایک لمبی سُرخ

2009/08/27 19:56

خراش کا تازہ نشان تھا ۔ "نہ نہلانے دیتی ہے نہ کپڑے بدلنے دیتی ہے ۔ سوزنی کی طرح حملہ کرتی ہے ۔" ۔

رضیہ سلطانہ اَور احمد شاہ کا آمنا سامنا :۔

پیر کرامت علی شاہ چھوٹی سی بیٹھی ہوئی آواز میں ، اپنے لفظوں کے اندر تیز تیز یہ قِصہ بیان کر چکے تو دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے ۔ معلوم ہوتا تھا وہ بیک وقت اِس بات سے پیچھا چھڑانا اور اسے تفصیل سے بیان بھی کرنا چاہتے ہیں ۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے متعدد بار وہ واقعات کو گڈ مڈ ، کرداروں کو آگے پیچھے اور صیغوں کو اُوپر نیچے کر گئے تھے ۔ جب دیوار سے ٹیک لگا کر اُنہوں نے ڈرتے ڈرتے اُوپر دیکھا تو اُن کی گھبراہٹ قدرے ختم ہوئی ۔ سلامت علی کی آنکھوں سے ملامت کے آثار ابھی چھٹے نہ تھے ، مگر اب اُس کے چہرے سے اشتیاق نمایاں تھا ۔ وہ آگے جُھک کر بیٹھا بغور سُن رہا تھا ، جیسے قِصے کی تہوں میں اُترتا جا رہا ہو ۔ یہ دیکھ کر پیر کرامت علی کو اپنے اندر کچھ قوت کا احساس ازسرِ نَو پیدا ہوتا محسوس ہوا ۔ اِس سارے قصے سے بچ نِکلنے کا اُنہیں اب ایک راستہ نظر آنے لگا تھا ۔ وہ راستہ یہ تھا کہ اسے ختم کرنے کی بجائے پوری تفصیل سے بیان کیا جائے ، تاکہ جہاں تک ممکن ہو سلامت علی اپنے اشتیاق کے اندر قِصے کے راز و رموز میں گم ہو جائے ، کِسی دوسرے زمانوں اور دوسرے لوگوں کے حالات میں اُلجھا رہے اَور پیر کرامت علی کو اپنے بیٹے کا سامنا نہ کرنا پڑے ۔ یہ بھرے طوفان کے اندر ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات تھی ، مگر فرار کی کوئی دوسری صورت اُس وقت اُن کی نظر میں نہ آرہی تھی ۔ چنانچہ وہ دوبارہ ہمت باندھ کر گویا ہوئے ۔ اب اُنہوں نے یہ کہانی اس طرح بیان کرنی شروع کی جیسے کہ کل ہی کی بات ہو ، جِس کے چھوٹے سے چھوٹے نقش کی اُن کے ذہن پہ تازہ چھاپ پڑی ہو ۔

"معاف کیجئے گا ،" رضیہ سلطانہ ادب سے بولی ، "میں نے آپ کو تکلیف دی ۔ تشریف رکھیئے ۔"

میاں احمد شاہ کے لئے مسعودہ خانم ایک لکڑی کی چوکی لے آئی تھی ۔ احمد شاہ اُس پہ بیٹھ گیا ۔ کوٹھڑی میں ہلکی ہلکی فضلے کی سڑاند تھی ۔ میاں احمد شاہ نے [illegible] پونچھ کر اُسے ناک کے آگے رکھ

2009/08/27 19:56

لیا ۔ رضیہ سلطانہ اُس کے سامنے دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گئی ۔ احمد شاہ پر نظریں جما کر اُس نے بات شروع کی ۔

"میں آپ کے روبرو اپنے جُرم کا اقبال کرنا چاہتی ہُوں ۔ تین مردوں کو میں نے قتل کیا ہے ۔ میں ان کے احوال بتانا چاہتی ہُوں ۔ اجازت ہو تو بتاؤں"

احمد شاہ جس کے لئے زندگی میں یہ پہلا ایسا موقع تھا ، گھبراہٹ سے بولا ۔ "ٹھیک ہے ۔ اپنے من کی بات کہو ۔"

"آپ کو تو پتا ہی ہے ، مُراد ایک غریب کھیت مزدور تھا ،" رضیہ سلطانہ نے بیان کرنا شروع کیا ۔ "اور علی محمد گاؤں کا ترکھان تھا ۔ دونوں سیدھے سادے دیہاتی تھے ۔ اُن کو ہلاک کرنا اِس لئے بھی آسان تھا کہ دونوں نوجوان تھے ۔ مُراد سب سے زیادہ خوش شکل تھا ۔ علی محمد کے مُنہ پر ماتا کے داغ تھے مگر وہ بھی چوڑا چکلا مضبوط جوان تھا ۔ ان دونوں کا پیچھا کرتی ہوئی میں ہر روز دیہاتی عورت کا بھیس بنا کر ، کمر میں تہمد باندھ کر ، کُرتہ پہن کر اور موٹا دوپٹہ اوڑھ کر رکھوال جایا کرتی تھی ۔ اِس سے مجھے چند روز میں اُن کے کام کاج کے اوقات کا پتا چل گیا ۔

"مُراد کا کام تمام کرنا سب سے آسان نِکلا ۔ اُس کو میں نے کھیتوں میں جا لیا ۔ مجھے عِلم ہو چُکا تھا کہ دوپہر کے وقت وہ صُبح کا کام ختم کر کے درختوں کے ایک چھوٹے سے جُھنڈ میں جاتا ہے اور وہاں وہ اپنی پوٹلی کھول کر اچار سے یا چٹنی سے روٹی کھاتا ہے ۔ کھانے کے بعد وہ اپنی گڑوی کے مُنہ پہ بندھا ہوا کپڑا کھولتا ہے اور لسی کے گھونٹ بھرتا ہے ۔ کھانے پینے کا کام ختم کر کے وہ اُٹھ کر پیشاب کرتا ہے اور پھر ایک درخت کی جڑ کے پاس لیٹ کر گھنٹہ دو ستایا کرتا ہے ۔ یہ اُس کا روزانہ کا معمول تھا ۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں وقت تک انتظار کروں جب تک کہ اُس کی آنکھ نہ لگ جائے اُس روز جب کھیتوں میں کام کر رہا تھا تو میں اُس جُھنڈ میں جا کر چُھپ گئی عین وقت مُراد اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور پوٹلی کھول کر روٹی کھانے لگا میں اُس سے دس بارہ فُٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی ۔ وہ روٹی چبا چبا کر کھا رہا تھا اور مجھے اُس کی جبڑے کی مچھلیاں اُبھرتی اور ڈوبتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھیں ۔ کھا چکنے

2009/08/27 21:59

بعد اُس نے خالی کپڑا سر کے گرد لپیٹ کر باندھ لیا اور گڑوی کا مُنہ کھول کر لسّی پینے لگا ۔ جب اُس کی پیاس بُجھ چکی تو اُس نے اُٹھ کر پیشاب کیا ۔ وہ ہمیشہ ایک ہی درخت کی جڑ میں پیشاب کیا کرتا تھا ، اور میں نے دیکھا تھا کہ ہر روز وہ اُس جڑ کی ایک ہی موری کے اندر پیشاب کی دھار مارتا تھا ۔ یہ اُس کی عادت تھی ۔ پیشاب کی حاجت سے فارغ ہو کر وہ آکر اپنی جگہ پر لیٹ گیا اَور گڑوی کا تکیہ بنا کر ستانے لگا ۔ کچھ دیر تک اُس نے آنکھیں بند رکھیں ۔ مگر پھر اُس نے کروٹ بدلی ۔ وہ پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا ، بدل کر سیدھا پُشت پر دراز ہوگیا اور آنکھیں کھول کر اُوپر درخت کی ٹہنیوں میں دیکھنے لگا ۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے مُنہ کھولا اور ماہیئے کے کچھ بول بولنے شروع کر دیئے ۔ میں نے چند منٹ انتظار کیا ، مگر وہ سونے کی بجائے اُٹھ کر ایک بار پھر پیشاب والے درخت کے پاس پہنچا ۔ وہاں اُس نے مخصوص موری کے اندر مُختصر سی دھار ماری اَور اپنی رانوں کو مَلتا ہوا واپس آکر دوبارہ گڑوی کے مُنہ پر سر جما کر لیٹ گیا اور ماہیا گانے لگا ۔ مَیں نے پہلی بار اُسے گاتے ہوئے سُنا تھا ۔ اُس کی آواز اُسی کی طرح مہین اَور نرم و نازک تھی اَور گاتے ہوئے اُس کے گلے میں ہلکی سی کپکپاہٹ پیدا ہو رہی تھی ۔ میں چُھپ کر کھڑی دیکھتی رہی ۔ مُراد نے ماہیا چھوڑ کر ایک عِشقیہ گانے کے بول شروع کر دیے ۔ میرے دِل میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی ۔ مگر مُراد کے اندر اُس دن نہ جانے کیسا طوفان آیا تھا ، سونے کا نام نہ لے رہا تھا ، آنکھیں کھولے پڑا گاتا جا رہا تھا اَور ہاتھ رانوں میں دیئے مَلتا جاتا تھا ۔ وقت گزرتا جا رہا تھا ۔ میرے دِل میں ملال آرہا تھا کہ میں نے غلط دِن کا انتخاب کیا ہے ۔ ایک خیال مُجھے یہ بھی آیا کہ میں اِس موقعہ کو اگلے دن تک ملتوی کر دوں ۔ مگر میرے سر میں جو جنوں تھا وہ مُجھے چَین نہ لینے دیتا تھا ۔ ایک گھنٹے سے زیادہ گُزر چُکا تھا ۔ آخر تنگ آکر میں جہاں پہ کھڑی تھی وہیں پہ لیٹ گئی ۔ لیٹ کر میں نے زمین پہ گِرے پتّوں اَور ٹہنیوں کو دبا کر کچھ کھڑکا کیا ۔ آواز سُن کر مُراد نے سر اُٹھایا ، اِدھر اُدھر دیکھا ، پھر سر ... پہ رکھ کر پہلو کے بل لیٹ گیا ۔ اُس نے گانا بند کر دیا تھا ۔ میں نے کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے ۔ اس سے جو شور پیدا ہوا اُس نے شُبہے کی گُنجائش نہ چُھوڑی ۔ اب مُراد اُٹھ کھڑا ہوا ۔ وہ نظریں جما کر اُس جگہ کی جانب بڑھا جہاں میں لیٹی تھی ۔ میری کمر میں جو تہمد بندھا تھا اُس کا ایک پلّو میں نے ایک طرف سے اُلٹ دیا ،

جس سے میری ایک ٹانگ اُوپر تک ننگی ہوگئی ۔ پھر میں آنکھیں میچ کر سیدھی لیٹ گئی ، جیسے گہری نیند سو رہی ہوں ۔ میری آنکھیں بند تھیں ، مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میرے اُوپر کھڑا ہے ۔ مجھے اُس کی سانس کی آواز تک سنائی دے رہی تھی ۔ دو تین مِنٹ کے بعد جب مجھے یقین ہوگیا کہ اُس کی نظریں میرے چہرے سے گزر کر میری ران پر جمی ہونگی ، میں نے ایک آنکھ ذرا سی کھولی ۔ وہ اب گھٹنے زمین پہ ٹیکے ، ہاتھوں کے بل جُھک جُھک کر میرے تہمد کی سِلوٹوں کے اندر جھانک رہا تھا ۔ اُس کی صورت ایسی تھی کہ اگر میرے دِل میں آگ نہ بھری ہوتی تو میری ہنسی نِکل جاتی ۔ یکایک میں نے دیکھا کہ اُس نے اپنی اُبھری ہوئی دھوتی کے بل کھولے اور اُسے الگ کر دیا ۔ اُس کے چہرے پہ ہیجان کی کیفیت دیکھ کر مجھے پتا چل گیا کہ اب وہ کیا کرنے والا ہے ۔ مگر اِس سے پہلے کہ وہ کُود کر میرے اُوپر سوار ہو جاتا ، میں اُچھل کر اُس کی زد سے باہر ہوگئی ۔ وہ ایک لحظہ حیرت سے گُم سُم ہوئے بیٹھا رہا ، پھر اُٹھ کر میرے پیچھے دَوڑ پڑا ۔ اُس کے آگے بھاگتی ہوئی میں اُس درخت تک پہنچ گئی جو اُس کے لیٹنے کی جگہ تھی ۔ وہاں پہنچتے ہی بجلی کی تیزی سے ایک خیال میرے دِماغ میں آیا کہ یہی بہترین موقع ہے ، اب جب کہ وہ خواہش کے مارے پاگل ہوا جاتا ہے اور کُودتا ہوا آرہا ہے ، اب وہ پُورے کا پورا وار سہے گا ۔ میرے ڈب میں اوزار بندھا تھا ، مگر مجھے اُس کی دراتی گڑوی کے پاس پڑی دکھائی دی ۔ میں نے اُس وقت وُہی اُٹھا لی ۔ مُڑ کر دیکھا تو وہ تگڑے بدن اپنی مردانگی کا پھل اُٹھائے دوڑتا ہوا میرے سر پہ پہنچ چُکا تھا ۔ اُس وقت وہ مجھے ایک پتلے دُبلے نوجوان کی بجائے ایک ایسے ہاتھی کی مانند دکھائی دیا جو سُونڈ اُٹھائے چڑھا آرہا ہو ۔ اُس نے جو ایک آخری چھلانگ لگا کر مجھے دبوچ لینا چاہا تو میں نے دراتی کا دندانے دار پھل اُس کی ٹانگوں کے بیچ چڑھا دیا ، پھر دونوں ہاتھوں سے دستے کو پکڑ کر جو اُسے اُوپر کو کھینچا تو آدھے پیٹ تک چیرتا ہوا چلا گیا ۔ خون کا فوارہ چھوٹ پڑا اور اُس کے عُضو کٹ کر ایک ایک نس سے لٹکنے لگے ۔ وہ اپنے پیروں سے ایک چھوٹی سی ہولناک آواز نِکلی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے صرف کو تھام لیا ۔ اُس وقت اُس کے چہرے پہ دُکھ درد کی کوئی علامت نہ تھی ، صرف ایک حیرانگی کا تاثر تھا ۔ جیسے ہی وہ زمین پہ گرا میں نے دراتی اُس کی گردن میں ڈال دی ۔ دراتی اُس کی گردن کے گِرد ایسی فِٹ آئی جیسے بنی ہی اس مقصد

2009/08/27 22:00

کے لئے ہو ، ایک ہی جھٹکے سے میں نے اُس کا گلا کاٹ دیا ۔ پھر میں نے درانتی کو گڑوی کے پاس پڑے ہوئے کپڑے سے صاف کیا اور وہاں سے چل پڑی ۔ واپسی پر میں نے درانتی کو گیہوں کے کھیت میں دبا دیا ۔ میرا تہمد اور کُرتا جگہ جگہ پہ خون سے تر ہو چکے تھے ۔ مَیں نے تہمد کھولا اور اُلٹا کر اُسے باندھا ۔ پھر مَیں نے چادر میں اپنے آپ کو لپیٹ لیا ۔ وہاں سے پھر مَیں تانگہ لے کر سیدھی شہر اپنے گھر کو چلی آئی" ۔ رضیہ سلطانہ واقعہ سُنا کر سانس لینے کو رُکی تو احمد شاہ ، جو چار خانہ رومال ناک پہ رکھے ، چہرے پہ سخت ناگواری اور صدمے کے آثار لِئے بیٹھا تھا اور جِس نے دو ایک بار بات کو بیچ میں ٹوکنے کے لِئے مُنہ کھولا تھا مگر رضیہ سلطانہ کی آواز کے آگے دب کر رہ گیا تھا ، بڑبڑا اُٹھا ،

"یہ باتیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں لڑکی ، خدا کے حضور توبہ کرنا اور گناہوں کی معافی مانگنا ہی کافی ہے ۔"

"میاں جی ،" رضیہ سلطانہ بولی ، "میں نے پہلے عرض کی تھی ، جب تک میں اپنے سارے جُرموں کے احوال بتا نہیں لیتی میرا اقبال نہیں ہو گا ۔ یہ احوال بیان کر کے ہی اَور اِس دوزخ سے دوبارہ گزر کر ہی میں اپنے وجود سے گناہوں کی سیاہی کو دھو سکتی ہُوں ۔ میری آخری رات ہے میاں جی ، پروردگار کے لِئے مجھے رد نہ کیجئے ۔ میری بات سُن لیجئے ۔" =

"احمد شاہ ماتھے پہ تیوری ڈالے ناگواری سے اُسے دیکھتا رہا ۔ کوٹھڑی میں گوسٹراند اِتنی ہلکی تھی کہ ایک بار نتھنوں میں بس گئی تو محسُوس نہ ہوتی تھی ، مگر احمد شاہ اُسی طرح رومال ناک کے آگے رکھے بیٹھا تھا ، گویا اپنے آپ کو رضیہ سلطانہ کے جراثیم سے ڈھک کر رکھنا چاہتا ہو ۔

"گھر سے کپڑے تبدیل کر کے ،" رضیہ سلطانہ بولی ، "مَیں نے سیدھا علی محمد کی دکان کا رُخ کیا ۔ انہی چند مہینوں میں جب مَیں ان دونوں کا پیچھا کر رہی تھی ، مَیں علی محمد کے ساتھ بھی کاروباری طور پہ واقفیت حاصل کر رہی تھی ۔ اُس کی گاؤں میں ترکھان کی دوکان تھی ۔ مَیں نے اُسے بتا رکھا تھا کہ میں چک اٹھاسی کی زمیندارنی ہوں ۔ اور اُس کے پیرمعوں کی مشہوری سُن کر آئی ہُوں ۔ یہ بات سُن کر وہ فخر سے پھُول گیا ۔ مَیں نے اُس سے کہا کہ میرے لِئے وہ خاص عمدہ قِسم کے جا[illegible] کی پرواہ نہ کرے ، جِتنی لاگت بھی

2009/08/27 22:00

آنے میں دینے کے لئے تیار ہوں ، مگر یہ خیال رکھئے کہ پیڑھے ایسے ہوں جن کی بناوٹ اور روغن اور نقش و نگار کی مثال علاقے بھر میں نہ ملتی ہو ۔ یہ کہہ کر میں نے ایک سو روپے کا نوٹ پیشگی رقم کے طور پر اس کے آگے رکھ دیا ۔ اتنے پیسے دیکھ کر علی محمد کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نوٹ اٹھا کر اپنی چٹائی کے نیچے سرکا دیا ۔ ساتھ ہی میں نے ایسی آنکھیں مٹکائیں کہ وہ وہیں پہ میرا گرویدہ ہوگیا ۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اٹھاسی کے بڑے زمیندار کی بہو ہوں ، اور میرا خاوند فوج میں لفٹین ہے جو بنگال گیا ہوا ہے ۔ علی محمد کی عجیب حالت تھی ۔ اس کی نظریں میرے اوپر سے نہ ہٹتی تھیں ۔ وہ مجھ سے کچھ مرعوب ، کچھ متاثر ، اور کچھ مبتلائے عشق نظر آرہا تھا ۔ میں کامیابی سے اپنا پہلا وار کر کے چلی آئی ۔ اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں اسی بہانے وہاں پہنچ جاتی کہ دیکھوں علی محمد نے میرے پیڑھوں کا کام شروع کر رکھا ہے یا نہیں ۔ وہاں بیٹھ کر میں اس کے ساتھ دنیا بھر کی باتیں کرتی اور گھنٹہ گھنٹہ بھر بیٹھی رہتی ۔ ہر بار جب جاتی تو اس کے قریب سے قریب تر ہو کر بیٹھتی ، اور کوئی مذاق کی بات بیچ میں آجاتی تو اسے ہولے سے ایک دھپ رسید کر دیتی ۔ اس کے علاوہ میں نے اس کے ساتھ رازدارانہ طور پر گفتگو کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا تھا ، جس کے دوران میں کبھی اس کے کندھے ، کبھی بازو اور کبھی سینے کو ہاتھ سے چھو دیتی تھی ۔ اب علی محمد نے بہت سا کام چھوڑ کر میرے پیڑھے بنانے شروع کر رکھے تھے اور دن رات انہی کی محنت پر لگا رہتا تھا ۔ جب میں رخصت ہونے کیلئے اٹھتی تو پوچھتا کہ اب میں کب اس کی دوکان پر آؤنگی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر دم میرے انتظار میں رہتا تھا ۔ دوکان اس کے گھر سے ملی ہوئی تھی ۔ بیچ میں ایک در تھا جو بند رہتا تھا ۔ دروازے کے اس طرف عورتوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں ۔ پوچھنے پر علی محمد نے بتایا کہ اس کی بوڑھی ماں اور اس کی بیوی گھر میں تھیں ۔ اس کی شادی کو ابھی چھ ماہ کا عرصہ ہی گزرا تھا ، اور اس کی بیوی حاملہ تھی ۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علی محمد میری زلف کا اسیر ہو چکا تھا ۔ اسی عرصے میں میں نے پتا لگا لیا تھا کہ دوپہر سے لے کر پانچ بجے تک اس کی دوکان تقریباً خالی ہوتی تھی ۔ صبح کے وقت اس کے پاس کاریگر یا کوئی ملنے والے آبیٹھتے تھے ۔ مگر ظہر سے لے کر عصر کے بعد تک وہ اکیلا ہی

2009/08/27 22:01

دوکان میں کام کرتا رہتا تھا ۔ خاص طور پر مَیں نے دیکھا تھا کہ جب بھی مَیں اُس کے پاس بیٹھی ہوتی تھی ، کوئی ایک آدھ آنکلتا تو باہر سے ہی دیکھ کر چلا جایا کرتا تھا ۔ دوکان کے یہ اوقات اتفاق سے میرے مقصد کے لئے عین موزوں تھے ۔ اُس روز مَیں گھر سے کپڑے بدل کر واپس رکھوال پہنچی تو عصر کا وقت ہو چلا تھا ۔ میرے دِل میں خدشہ تھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے ۔ مجھے پکڑے جانے کی فِکر نہ تھی ، صرف اِس بات کا اندیشہ تھا کہ ابھی میرا کام نصف بھی مکمل نہ ہوا تھا ۔

خوش قِسمتی سے گرمیوں کے دن شروع ہو چکے تھے ۔ گاؤں کی گلیوں میں اکا دُکا لوگ ہی چل پھر رہے تھے ۔ مَیں نے چادر اپنے گِرد اِس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ جِسم اَور سر اَور نِصف چہرہ پورے طور پر ڈھکے ہوئے تھے ۔ چادر تلے میں نے سفید ململ کا چولا پہن رکھا تھا جِس کے نیچے شمیز یا انگی کچھ بھی نہ تھی ۔ مُنہ نیچا کئے تیز تیز چلتی مَیں علی محمد کی دوکان پر پہنچی ۔ دروازے کا ایک پٹ ہمیشہ بھڑا رہتا تھا ۔ اِس وقت دوسرا بھی دُھوپ سے بچنے کی خاطر آدھا بند تھا ۔ حسبِ اُمید علی محمد اکیلا اندر بیٹھا تھا ۔ یہ سب سے اچھی بات تھی جو میرے حق میں ہوئی تھی ۔ اُس وقت اگر کوئی اُس کے پاس موجود ہوتا اور مجھے آتے ہوئے دیکھ لیتا تو میرے لئے مُشکل پیدا ہو جاتی ۔ علی محمد جِسم سے ننگا ، صرف ایک دھوتی باندھے ہوئے تھا اَور اُس کے سِینے پر پسینے کی دھاریاں چل رہی تھیں ۔ مَیں نے دوکان میں داخل ہوتے ہی دوسرا پٹ بھی بند کر دیا ۔ اُف ، مَیں بولی ، کیسی غضب کی گرمی پڑ رہی ہے ، اَور چادر اُتار کر الگ رکھ دی ۔ علی محمد نے جو باریک چولے کے اندر میرا بدن دیکھا تو اُس کی آنکھیں پھٹ گئیں ۔ دوکان میں اب روشنی صرف ایک چھوٹی سی چوکور کھڑکی کے راستے آرہی تھی جو دیوار میں ذرا اونچائی پہ لگی تھی اَور روشندان کا کام بھی دیتی تھی ۔ علی محمد نے دو پیڑھے تیار کر رکھے تھے جو اُس کے پہلو میں پڑے تھے ۔ مَیں جا کر ایک پیڑھے پر بیٹھ گئی ۔ اب میں اِس صورت میں تھی کہ اُس کے بہت قریب بیٹھی تھی ، یُوں کہ میرے گھٹنے اُس کے بازو سے مِلے ہوئے اَور وہ گردن موڑ کر مُتواتر مجھے اَور چولے کے اندر میرے سِینے کو دیکھے جا رہا تھا ، گویا کسی جادو کے اثر میں ہو ۔ اُس کا چہرہ فرطِ جذبات سے مغلُوب ہو رہا تھا اَور اُسے پتا نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے اَور کیا نہ کرے ۔ اُس کے ہاتھ میں

2009/08/27 22:01

کپکپاہٹ پیدا ہو رہی تھی ۔ وہ ایک تندرست بدن کا نوجوان تھا جس کے بازوؤں کے پٹھے مچھلیوں کی مانند تڑپتے تھے اور پیٹ کی سلوٹیں باریک رسیوں کی مانند تھیں گویا چربی کی ایک رتی اُن کے اندر نہ ہو ۔ پسینہ اُس کے جسم پہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور اُس کی نظریں بار بار میرے بدن سے اُچک کر دروازے کی جانب جاتی تھیں اور پھر واپس میرے اُوپر مرکوز ہو جاتی تھیں ۔ مَیں کچھ اور آگے جُھک کر بیٹھ گئی جس سے میرے چولے کا گلا ڈھلک آیا ۔ علی محمد کی نظریں اب چولے کے اندر سے سیدھی میری چھاتیوں پر پڑ رہی تھیں ۔ وہ ایسے انداز سے بیٹھا تھا کہ اُس کی دھوتی ایک جگہ سے اُلٹ گئی تھی جہاں سے مَیں اُس کی ران کے تنے ہوئے پٹھوں کو دیکھ سکتی تھی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ دھوتی کے اندر اُس کے پٹھے آہستہ آہستہ پھیلتے جا رہے ہیں ۔ علی محمد کو اپنی کچھ خبر نہ تھی ۔ وہ مجھے پیڑے دکھانے بھی بھول چُکا تھا ۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر وہ ٹکٹکی باندھے مُجھے دیکھے جا رہا تھا ۔ وقت نکلتا جا رہا تھا ۔ مجھے پتا تھا کہ ابھی ظہر کی اذان ہوگی اور پھر لوگوں کی چہل پہل شروع ہو جائے گی ۔ مَیں مزید وقت ضائع نہ کرنا چاہتی تھی ۔ اُسی وقت وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا ۔ وہ عظیم الجثہ آدمی مجھے ایک ایسے انجن کی مانند لگا جو شنٹ کرتا ہوا میرے سر پہ چڑھ آیا تھا ۔ نظر بچا کر میں نے ڈب سے چاقو نکالا اور تیزی سے اُس کے پیٹ میں گھونپ دیا ۔ ایک تجربہ مجھے پہلے ہو چکا تھا ، لہٰذا اِس بار خون کے چھینٹے میں نے اپنے اُوپر نہ پڑنے دیے ۔ دستے کو گرفت میں رکھتے ہوئے میں پہلو بدل کر علی محمد کی پُشت کی جانب جا کھڑی ہوئی ۔ علی محمد نے سر موڑ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی ، اور اُس وقت میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں پھر گئی ہیں ۔ پیٹ کو پکڑے پکڑے وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ آرہا ۔ ایک بار اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر پہلو کے بل گر گیا ۔ مَیں نے یکے بعد دیگرے دو تین چاقو کے وار [illegible] ایک بار میرا ہاتھ خون اور پسینے کی وجہ سے پھسل گیا ، مگر دو بار میں نے [illegible] کا پھل اُس کی پسلیوں کے بیچ اندر تک اُتار دیا ۔

علی محمد نے زمین پہ پڑے پڑے مُنہ سے ایسی آواز نکالی جیسے [illegible] بھونک مارتا ہے ۔ میں نے چٹائی سے اُس کی قمیض اُٹھا کر اُس کے مُنہ پر دبا دی جس سے اُس کی آواز رُک گئی ۔ کچھ دیر کے بعد جب اُس کا جسم بے [illegible] ہو گیا ، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور مُنہ سے خون جاری ہونے لگا تو میں نے اُس کی